

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

اشارات

یوں تو پوری دنیا تے اسلام مدتِ دراز سے انخطاط کا شکار ہے لیکن بدینِ محمدی سال سے اس انخطاط کے جو روحِ فسادِ واقعات سامنے آرہے ہیں وہ اپنے اندر عبرت کے بیشمار پہلو رکھتے ہیں۔ دُور نہ جائیے صرف پچھلے ایک دو ماہ کے حوادث پر نگاہ ڈالیے تو آپ کو مسلمانوں کے انتشار اور کس مہمپرسی کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔

افریقہ میں ناٹجیریا کے شمالی صوبے کے نیک دل اور نڈا ترس وزیر اعظم الحاج احمد دینو کی مظلومانہ شہادت کے زخم ابھی مندمل نہ ہونے پاتے تھے کہ اخبارات میں گنی کے صدر شیخ طور کی دریا دلی کا تذکرہ شائع ہوا جس کے سخت انہوں نے ایک رسوائے زمانہ عیسائی امر کو جس کی اب ساری دلچسپیاں اشتراکیت کے دستہ میں، پورے ملک کی قسمتِ طشری میں رکھ کر نذرانے کے طور پر پیش کر دی اور یہ سخاوت کرتے وقت انہوں نے نہ تو اپنی قوم کو اعتماد میں لینا مناسب سمجھا اور نہ حالات و واقعات پر کوئی نگاہ ڈالنا ضروری خیال کیا۔ ابھی اس وحشتناک خبر کی سیاسی خشتک نہیں ہونے پائی کہ یہ اطلاع سننے میں آئی ہے کہ انڈونیشیا کے مرد آہنی سکار نو اپنے سارے اختیارات بری فوج کے کمانڈر کو سپرد کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں اور ملک کا پورا نظم و نسق کمانڈر صاحب نے سنبھال لیا ہے۔

اس وقت دنیا تے اسلام جس تیزی کے ساتھ زیر و زبر ہو رہی ہے اُسے ایک وقتی اور اتفاقی حادثہ سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے

سرے تک جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں وہ ایک زبردست طوفان کی زد میں ہیں اور انہیں کہیں بھی چین اور آرام سے جینا نصیب نہیں ہو رہا۔ یہ اندوہناک صورت حال اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم ان اسباب کا کھوج نکالیں جن کی وجہ سے دنیا کے اسلام پر یہ عذاب نازل ہو رہا ہے۔

ایک مورخ نے مسلمانوں کے عروج و زوال پر بحث کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ یہ قوم جب دنیا کو فتح کرنے کا عزم لے کر اٹھی تو اس کے ایک ہاتھ میں قرآن تھا اور دوسرے میں تلوار۔ کچھ مدت تک تو اس نے قرآن کے دیسے ہوئے ضابطہ حیات کے مطابق قوت و اقتدار کو (جس کی تلوار علامت ہے) بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ استعمال کیا لیکن پھر دنیا کی محبت دین پر غالب آگئی اور اُس نے قرآن کو چھوڑ کر دنیاوی مال و متاع سمیٹنا شروع کر دیا۔ اب اس کے ایک ہاتھ میں تلوار رہ گئی اور دوسرے میں اقتدار کی دولت۔ کچھ مدت تک یہ صورت قائم رہی اور اُس نے تلوار کے بل بوتے پر دنیا کو سرنگوں رکھا مگر کوئی بلند نصب العین سامنے نہ ہونے کی وجہ سے اُس کے بازو جلد ہی شل ہو گئے اور وہ میدان میں ٹھک ہار کر بیٹھ گئی۔ اسلام کو تو وہ دنیا کے لالچ میں پہلے ہی خیر باد کہ چکی تھی اب قوت و طاقت نے بھی جواب دے دیا اور اس طرح یہ زوال کا شکار ہوئی۔

اُس مورخ کے ذہن میں اسلام کے خلاف جو تعصب ہے غالباً اسی کے زہریلے اثرات کے تحت اُس نے قرآن اور تلوار کا ایک ساتھ ذکر کیا ہے لیکن اگر اُس کے اس طرز فکر کو نظر انداز کر کے اس کی صحیح صورت سامنے لائی جائے تو مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان ہمیں یوں نظر آتی ہے کہ ایک قوم ایک حیات آفریں اور انسانی فلاح و بہبود کے ایک ہمہ گیر اور وسیع تصور سے لذت آشنا ہو کر، دنیا کے سینے پر اُبھری۔ اس تصور نے اُس کے اندر زندگی کی حرکت اور حرارت پیدا کی، اپنی صلاحیتوں کو تعمیری راہ پر لگانے کا دلولہ بیدار کیا اور اس

کے اندر اس امنگ کو جنم دیا کہ عظمت و حکمت کے جن لازوال سرچشموں سے وہ فیض یاب ہو رہی ہے، اُن سے دوسری قوموں کی کشتِ دیران کو بھی سیراب کرے اور اس نیک اور پاکیزہ مقصد کی راہ میں اگر کوئی باطل قوت حاصل ہو اور وہ سیدھے طریق سے راستہ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہو تو پھر اُسے قوت سے ہٹا دیا جائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جلیل القدر رفقاء نے اللہ تعالیٰ اُن کی قبروں کو نور سے بھر دے، قوت و اقتدار کو کبھی مطلوب مقصود نہ ٹھہرایا تھا بلکہ اسے نصب العین کے حصول کے لیے ایک مؤثر ذریعہ ہی قرار دیا۔ ان کا نصب العین بلکہ غایت الغایات ہمیشہ ایک ہی رہی کہ کسی طرح دینِ حق دنیا میں سر بلند ہو اور اس کی راہ میں مفاد پرست افراد یا گروہ جو رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں انہیں راستہ سے ہٹا دیا جائے یا انسانیت پر اپنی کبر بانی قائم کرنے والوں کے ناپاک عزائم کو ناکام بنا کر نوع بشری کو خدائے برتر کی غلامی قبول کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

بدقسمتی سے یہ صورتِ حال زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ مسلمانوں نے قوت و طاقت کے سرچشمے سے مُنہ موڑ لیا اور جاہ و مال اور قوت و اقتدار کو زندگی کا اصل مقصد قرار دے کر زندگی بسر کرنا شروع کی۔ فکر و نظر کی تبدیلی معاشرے کے مختلف طبقات میں مختلف حیثیت سے نمودار ہوئی۔ جو لوگ اقتدار کے رسیا تھے انہوں نے اپنی ساری توجیہ اس کے حصول اور حفظ و بقا کے لیے صرف کرنا شروع کر دی۔ انہوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ دنیا میں قوت کا حقیقی سرچشمہ کسی پاکیزہ اور بلند نصب العین کا عشق نہیں بلکہ تخت و تاج کا حصول ہے۔ اسی لیے ان کی اسلام سے وابستگی دن بدن کمزور ہونے لگی اور ساری تنگ و دو کامرکز و محور اقتدار کا حصول بن کر رہ گیا۔ اگر اس اقتدار سے اُن کی غرض اسلام کی سر بلندی ہوتی تو وہ دین سے کبھی بھی کسی معاملے میں صرف نظر کرتے بلکہ اسے اپنے انکار و اعمال میں زیادہ سے زیادہ اپنانے کی کوشش کرتے تاکہ قوت کے اس انتہا خزانے

سے وہ پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ لیکن محض اقتدار کو مقصد ٹھہرانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ہر چیز کو اسی راہ پر قربان کر دیا۔

اسلام اور مسلم سوسائٹی کو اس غلط اندازِ فکر سے متعدد نقصانات پہنچے ہیں، ان میں دو غیر معمولی طور پر تباہ کن ثابت ثابت ہوئے ہیں۔ پہلا نقصان جو اسلام اور مسلم سوسائٹی کو پہنچا وہ یہ ہے کہ مسلم ممالک کی دولت اور ان کے ذرائع و وسائل کی بہت بڑی مقدار جسے اسلام کو حیاتِ انسانی کا اصل مقصد قرار دینے کی صورت میں دینِ حق کی سر بلندی کے لیے صرف ہونا چاہیے تھا وہ ایک فرد یا گروہ کے مفادات کی پاسبانی میں بے دریغ صرف ہونے لگی۔ حکمرانوں نے معاشرے کی اصلاح پر توجیہ دینے کے بجائے اپنا پورا زور دشمنوں کو نیچا دکھانے پر صرف کر دیا اور وہ خزانہ جو قوم کی امانت تھا اُس پر خوشامدیوں اور ضمیر فروشوں کے گروہ پلنے لگے۔ چنانچہ ایک طرف امت کی دولت برباد ہوئی اور دوسری طرف اس کے اندر ضمیر فروشوں کا خوفناک اور تباہ کن مرض سرایت کرنے لگا جس نے بالآخر اس کے اجتماعی اخلاق کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا

ماننی پر نگاہ ڈالنے کے بجائے اگر آپ دورِ حاضر کی دنیاٹے اسلام کا معاشی نقطہ نظر سے جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ ممالک جو کبھی سونا اگلا کرتے تھے اور اپنی دولت و ثروت کی وجہ سے دنیا میں ممتاز تھے آج افلاس کا شکار ہیں۔ ابھی چند روز ہوتے کہ ڈیلی ٹیلیگراف میں مصر کی معاشی حالت پر ایک تبصرہ شائع ہوا ہے جس میں وہاں کے وزیرِ اعظم ذکریا محی الدین کی زبانی اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ ملک کی اقتصادی حالت دن بدن دگرگوں ہوتی جا رہی ہے۔ ایک طرف زرمبادلہ کے ذخائر تشویشناک حد تک کم ہو چکے ہیں اور دوسری طرف قیمتوں میں بڑی سرعت کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ غیر ملکی تجارت میں حکومت کو ہر سال بیس کروڑ پونڈ کے لگ بھگ خسارہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ بڑھتے ہوئے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے آئے دن نئے معمول

عائد کیے جا رہے ہیں جن کی وجہ سے عوام کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ غیر ملکی قرضے جن کی مالیت ایک ارب پونڈ تک پہنچ چکی ہے ملک کو استعماری طاقتوں کی جکڑ بندیوں میں بُری طرح جکڑ رہے ہیں۔

اس اندوہناک صورتِ حال سے صرف مصر ہی دوچار نہیں۔ بیشتر مسلمان ممالک کو قریب قریب اسی قسم کی پریشانی لاحق ہے۔ اس کی دولت کا زیادہ حصہ حکمرانوں کی شخصیت کو نمایاں کرنے پر صرف ہو رہا ہے۔ نشر و اشاعت کے سارے ذرائع ان اصحابِ اقتدار کی مدح سرائی، ان کے کارناموں کو اچھلنے، اور ان کی غلط پالیسیوں کو صحیح اور برحق ثابت کرنے میں استعمال ہو رہے ہیں اور ان کے ذریعہ قومی تعمیر و ترقی کا جو کام بطریقِ حسن لیا جاسکتا ہے وہ سارا یکسر نظر انداز ہو رہا ہے۔

تخت و تاج کے حصول کو حیاتِ انسانی کا بنیادی مقصد قرار دینے کی وجہ سے مسلم سوسائٹی کو دوسرا نقصان یہ پہنچا کہ سوسائٹی کے اونچے طبقوں میں سازشوں اور باہمی رقابتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہر وہ فرد جس نے عز و جاہ اور دولت کے اعتبار سے اپنے آپ کو اقتدار کے نسبتاً قریب خیال کیا اس کے مُنہ میں فوراً پانی آگیا اور اس نے ایک ہی جہت میں تخت پر متمکن ہونے کی کوشش کی۔ دوسری طرف وہ حضرات جو تخت پر پہلے سے قابض تھے انہوں نے ہر وقت فضا میں پھیلے ہوئے مختلف حضرات کو سُونگھنے کی کوشش کی۔ انہیں اس بات کی کوئی فکر نہ تھی کہ قوم کا اخلاق بگڑ رہا ہے، انہیں اس چیز کی بھی کوئی پروا نہ تھی کہ لوگوں کی معاشی حالت برباد ہو رہی ہے بلکہ انہیں ہمیشہ ایک ہی فکر دامنگیر رہتی کہ ملک کی سیاسی فضا میں کوئی ایسا تہوج رُو نما نہ ہو جو ان کے لیے کسی وقت بھی خطرے کا باعث بن سکے۔ اقتدار کے حریفوں کی اس کشمکش میں عوام کا براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ بچارے مفت میں انگریزوں کی ان بندوں کی حرص و آرز

کی بھینٹ چڑھ جاتے۔ مغلوں کے آخری دور میں محلاتی سازشوں کی وجہ سے ملت کا شیرازہ جس بڑی طرح سے منتشر ہوا وہ تاریخ کی کوئی دھکی چھپی داستان نہیں بلکہ ایسا المناک سانحہ ہے جس کی یاد ابھی تک مسلمانوں کے سینوں سے محو نہیں ہوئی۔ یہ ان سازشوں کا ہی نتیجہ تھا کہ ملت اسلامیہ کمزور پڑتی گئی اور مغربی اقوام کو اس پر یلغار کرنے کی شہ ملی۔

ماضی میں تو خیر جو کچھ ہوا وہ تو ہوا لیکن حال میں بھی صورت حال کسی اعتبار سے اطمینان بخش نہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ پوری دنیا نے اسلام باہمی سازشوں اور رقابتوں کا ایک اکھاڑ ہے جس میں ہر شخص ایک دوسرے کو بچھاڑنے میں مصروف ہے جس فرد کا بس چلتا ہے وہ فوج کی مدد سے عوام کی گردنوں پر ان کی منشا اور مرضی کے علی الرغم مسلط ہو جاتا ہے اور پوری قوم خواہ اس ظلم اور ناانصافی کے خلاف کتنی شدید صدائے احتجاج بلند کرتی رہے۔ وہ اقتدار کے تخت کو چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتا بلکہ اپنی ساری صلاحیتیں اور قوتیں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے پر صرف کرتا رہتا ہے۔ اسے اس بات کی کبھی فکر لاحق نہیں ہوتی کہ وہ عوام کے دلوں کو مسخر کرنے کی کوشش کرے اس کا سارا وقت عوام پر اپنی گرفت مضبوط کرنے اور اپنے مخالفوں کا زور توڑنے میں صرف ہوتا ہے۔ اس غرض کے لیے ملک کے وسائل اور اس کی انتظامی مشینری بے دریغ استعمال کی جاتی ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ملکی نظم و نسق کے ذمہ دار اصحاب اپنی اصل ذمہ داریوں سے عہدہ براہونے کے بجائے اپنی ساری توجہ برسر اقتدار گروہ کے تسلط کو قائم کرنے میں صرف کر دیتے ہیں اس سے ملک کے انتظامی ڈھانچے میں زبردست بگاڑ رونما ہوتا ہے پھر انسانوں کو جب ایک مدت تک آہنی گرفت میں رکھ کر لیے بس بنا دیا جائے تو ان میں اندرونی طویل پیرا پنے بنیادی حقوق کے بارے میں ایک عام لاپرواہی اور ملکی اور ملٹی معاملات کے متعلق نفرت اور بیزاری کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ جب یہ محسوس کرتے ہیں کہ کسی ملک میں

اصل اور فیصلہ کن چیز رائے عامہ نہیں بلکہ اقتدار ہے اور یہ قوتِ فاہرہ اپنی من مانی کارروائیاں کرنے میں یکسر آزاد ہے اور عوام کو ان کے منشا کے خلاف اپنی دلپسند راہ پر جبر کے ساتھ چلا سکتی ہے اور وہ بیچارے طاقت کی اس اندھی لاٹھی کے اشارے پر حرکت کرنے پر اپنے آپ کو بالکل مجبور پاتے ہیں تو ان کے اندر بالکل فطری طور پر بددلی اور مایوسی پیدا ہونے لگتی ہے اور وہ امورِ محکمہ کے بارے میں بالکل خاموش تماشائی بن کر رہ جاتے ہیں۔ بوسر اقتدار حضرات عوام کے اس مرض کے تدارک کے لیے قطعاً فکر مند نہیں ہوتے کیونکہ ان کی قوت کا سرچشمہ عوامی تائید نہیں ہوتی بلکہ نوکر شاہی طبقہ ہوتا ہے اس لیے وہ رائے عامہ سے یکسر بے نیاز ہو کر اپنے دل کے ارمان نکالتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ حضرات ہر وقت ایسی تدابیر سوچتے رہتے ہیں جن کو بروٹے کار لاکر وہ عوام کو ملکی معاملات سے زیادہ سے زیادہ بیگانہ اور بے تعلق رکھ سکیں۔

جو لوگ اس نشوونما کی صورتِ حال سے متاثر ہو کر مقتدر ہاتھوں میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں وہ بھی عوام کی مایوسی اور ان کی بے بسی کو دیکھ کر ہمت ہا بیٹھتے ہیں اور اس تبدیلی کے لیے کسی آسان فارمولے یا کسی سستے اور زود اثر نسخے کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں جسے استعمال کر کے وہ جلد از جلد خاطر خواہ نتائج حاصل کر سکیں۔ عوام کی فلاح، ان کے اخلاقی اور سیاسی مسائل، ان کے فکری رجحانات ان حضرات کی توجہ کا کبھی مرکز نہیں بنتے پاتے۔ وہ بھی انہیں بھڑکبھڑکیوں کا ایک گلہ سمجھتے ہیں جن سے اقتدار پر فائز ہونے کے بعد ہر قسم کا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ وہ ان کی پریشانیوں کو صحیح طور سے سمجھنے اور ایک اہل دل انسان کی طرح انہیں دُور کرنے کے بجائے ان کے احساسات سے کھیلنے ہیں اور ان کی تربیت کر کے انہیں تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے کے بجائے ان کے جذبات میں مختلف طریقوں سے ہیجان اور اشتعال پیدا کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک

جذبات کی یہی متلاطم لہریں انہیں ایک ہی ریٹے میں ساحلِ مراد پر پہنچانے کے لیے کافی ہیں۔

آپ کو اگر عوام کی اس بے بسی کا اندازہ لگانا مقصود ہو تو ماضی کے اوراق اٹھنے کے بجائے صرف گئی کے حالات پر نگاہ ڈالیں۔ اس سے مسلم ممالک میں عوام کی بے بسی اور بے کسی کی پوری تصویر آپ کے سامنے آجائے گی۔ گنی۔ افریقہ کے مغربی ساحل کے ساتھ ایک چھوٹا سا ملک ہے جس کے شمال میں پرتگالی گنی، جنوب میں لائبیریا اور سیرالیون مشرق میں جمہوریہ مالی اور آئیوری کوسٹ اور مغرب میں بحر اوقیانوس واقع ہے گنی میں دو تہائی اکثریت مسلمانوں کو حاصل ہے۔ پھر اس کے ارد گرد جتنے ممالک ہیں ان میں بھی صرف لائبیریا کو چھوڑ کر مسلمانوں کی آبادی غیر مسلمانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ مثلاً مالی میں ۸۰ فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح سیرالیون، گینیا، پرتگالی، اور آئیوری کوسٹ میں بھی مسلمانوں کا تناسب ۶۶ فیصد سے کسی طرح کم نہیں۔ اس نقطہ نظر سے اس خدشہ کا اظہار بھی قطعاً بے بنیاد ہے کہ گنی چونکہ غیر مسلم طاقتوں کے درمیان گھرا ہوا تھا اس لیے اس کا فرمانروا نکر و مہ جیلے آئمر کے حق میں دست بردار ہونے پر مجبور ہوا ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر جب ہم گھانا اور گنی کے معاشرتی اور تاریخی پس منظر پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہاں بھی ہم کوئی قدر مشترک نہیں پاتے۔ گھانا انگریزی استعمار کے قبضے میں رہا اور اس بنا پر وہاں انگریزی کا دور دورہ ہے۔ گنی نے فرانس کے تسلط سے نجات حاصل کی ہے اور اس وجہ سے یہاں فرانسیسی زبان کو بالادستی حاصل ہے۔

پھر گھانا کے اس آئمر و مہ میں بھی کوئی ایسی غیر معمولی صلاحیت نہیں پائی جاتی جس کی بنا پر گنی میں اس کا وجود کسی خیر و برکت کا موجب ثابت ہو سکتا ہو۔ اس نے گھانا میں عوام پر جو بے پناہ مظالم ڈھائے، اُن کے جذبہ آزادی اور حریت کو جس بیدردی کے ساتھ پامال

کیا اور ان کے گارڈھے پسینے کی کمائی کو اپنی عیاشیوں میں جس طریق سے صرف کیا اُس کی کسی ایسے شخص سے توقع نہیں کی جاسکتی جسے انسانی بنیادی اخلاق کا ذوق برابر بھی پاس ہو۔ یہ شخص خود پرستی کے مرض میں خطرناک حد تک مبتلا تھا۔ اسے ہمیشہ ایک ہی فکر دامگیر رہتی تھی کہ کسی طرح لوگوں کو اپنی ذات کی غیر مشروط اطاعت اور غلامی کے لیے ذہنی اور جذباتی طور پر تیار کیا جائے۔ اس غرض کے لیے اس نے بڑے ہی ناجائز حربے استعمال کیے جس میں جس شخص کے بارے میں بھی اُسے اپنی مخالفت کا شبہ ہوگا اسے جیل میں ڈال دیا۔ ایک مشہور بل کے ذریعہ اُن تمام اخبارات کو بند کروا دیا جو اس کی تعریف و توصیف میں ذرا بھی متماثل تھے۔ اس کے اس مطلق العنان رویے سے ملک کی سب سے اونچی عدالت بھی محفوظ نہ تھی۔

۱۹۶۳ء میں اس نے چیف جسٹس کو صرف اس لیے برطرف کر دیا کہ اس نے حکومت سے اختلاف کرنے والے تین رہنماؤں کو بے گناہ پا کر قید سے رہائی کے احکام صادر کیے۔ بعد ازاں اس سمر پھر سے آمر نے یہ اختیار بھی حاصل کر لیا کہ وہ قومی مفاد کے پیش نظر عدالتی احکام کو بھی غسونج کر سکتا ہے چنانچہ اگلے سال ۱۹۶۴ء میں اس نے سپریم کورٹ کے تین ججوں کو کوئی وجہ بنا کر بغیر برطرف کر دیا۔

اس شخص کی شاہ خرچیوں کا یہ عالم تھا کہ جب اس نے چند سال پیشتر ملک کی عنانِ اقتدار سنبھالی تو اُس وقت سرکاری خزانے میں پانچ کروڑ ساٹھ لاکھ ڈالر تھے اور اب اسے معزول کرنے کے بعد جب ملک کی مالی صورتِ حال کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس وقت یہ بد نصیب ملک ایک سو کروڑ ڈالر کا مقروض ہے۔ یہ رویہ کہاں صرف ہوتا تھا اس کی جو تفصیلات اخبارات میں شائع ہوئی ہیں اُن سے اس امر کی ملک دوستی کی نہایت گھناؤنی تصویر سامنے آتی ہے۔ اس شخص نے عکرہ میں ایک کروڑ پونڈ کی لاگت سے ایک بم پروٹ ہال تعمیر کروایا۔ اس کے ذاتی اخراجات پر کتنا روپیہ خرچ ہوتا تھا اس کا اندازہ اس ایک بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ تازہ دورہ چین پر روانہ ہوتے ہوئے یہ شخص سینتالیس ہزار پاؤنڈ کا زیور لہ

سرکاری خزانہ سے اٹھا کر لے گیا۔ اس سلسلہ میں یہ چیز لوہری طرح ذہن نشین رہے کہ یہ خطیر رقم اُس کی بالکل ذاتی اور خانگی ضروریات پر خرچ ہونی تھی کیونکہ اس کا سارا سفر خرچ اس رقم سے الگ سرکاری خزانے سے ادا ہونا تھا۔

یہ شخص انتہائی عیاش ہے اور اپنی عیاشیوں پر روپیہ پانی کی طرح بہاتا ہے۔ اس نے اپنی ایک دانشتہ کو ٹیلیوژن پر وگر اموں کی افسرِ اعلیٰ مقرر کر رکھا تھا اور اسے ایک اعلیٰ درجہ کی ایئر کنڈیشننگ امریکی کار لے کر دی جو عیاشی اور تفریح کے لیے استعمال ہوتی رہتی تھی۔ لوگوں کی بہو سیٹیوں کی عفت اور عصمت کو برباد کرنے کے لیے اس آمر کی ہدایت کے مطابق منصوبے تیار ہوتے اور اس کی شہ پر سرکاری غنڈے عوام کی عزت پر بلا خوف و خطر ہاتھ ڈالتے۔ وہ لوگ جنہوں نے سرکاری عہدوں کے حصول اور حکمران کے تقرب کے لیے اپنی غیرت کا خود گلا گھونٹ دیا وہ تو اسی رخ پر بہ نکلے جس رخ پر کہ بد اخلاقی کا یہ طوفان انہیں بہا کر لے جانا چاہتا تھا لیکن وہ حضرات جن کے نزدیک عزت و عفت کی کوئی قدر و قیمت تھی اور اخلاقی اقدار کو قومی زندگی میں کوئی اہمیت دیتے تھے ان کے لیے یہ باتیں سخت ناقابلِ برداشت تھیں۔ چنانچہ اس آمر کے عہدِ حکومت میں بیچارہ ذہین لوگ ملک چھوڑ کر انگلستان اور دوسرے علاقوں میں چلے گئے اور بہت سے فوجی اور سول حکام نے اپنی ملازمتوں کو خیر باد کہہ دیا۔

ایک طرف قوم کے اخلاق اور اس کے ضمیر کا دیوالیہ نکل رہا تھا اور زندگی عوام پر ایک عذاب بن کر مسلط ہو رہی تھی لیکن دوسری طرف حکومت عوام کو برابر یہ باور کرنے میں مصروف تھی کہ ان کا اقبال ترقی پر ہے اور نیکرو ماُن کے لیے مسیحا کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنی شخصیت کی برتری کا مصنوعی نقش لوگوں کے دلوں میں بٹھانے کے لیے گھانا کی ڈاک کے ٹکٹوں پر اور ملکی سکوں پر اس آمر کی نصابی زبانیاں ہونیں، جبکہ جبکہ اُس کے مجسے نصب کیے جانے اور بجلی کے نمقوں کی مدد سے لاکھوں روپے کے صرف کے ساتھ اس کا نام شاہراہوں اور بڑی عمارتوں

پر چمکانے کا انتظام کیا جاتا۔ نوخیز نسلوں کے دل و دماغ میں اُس کے متعلق بڑے ہی باطل تصور کے نفوشِ مثبت کیے جاتے۔ چنانچہ یہ معصوم بچے سب صبحِ خدا اور سیورِ مسیح کی حمد و ثنا کا گیت گاتے تو ان دو مقدس ناموں کے ساتھ مکروہ کا نام بھی شامل کرنے پر مجبور ہوتے۔

جس شخص کا طرزِ فکر اتنا لمحہ دار، جس کا مزاج اتنا آمرانہ اور جس کا طرزِ عمل خود اپنے بھائی بندوں کے ساتھ اتنا ظالمانہ بلکہ سفاکانہ رہا ہو اُسے ایک شخص ایک ایسی مملکت کے سیاہ و سپید کا مالک بنا دیتا ہے جس کے باشندوں کی عظیم اکثریت اسلام پر ایمان رکھتی ہے۔ پھر معاملہ اسی پر ختم نہیں ہوتا بلکہ مسلمان سپاہ کو اس ظالم کے چھنے ہوئے اقتدار کو اسے واپس دلانے کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ بھڑکے بکریوں کے گلے کو بھی کسی سمت ہانکتے ہوئے چرواہا اس بات پر غور کرنا ہے کہ کیا جس طرف وہ اس گلے کو لے جانے کا عزم کر رہا ہے وہاں مہیب غار تو نہیں پائے جاتے جہاں ان جانوروں کے گرنے کا خطرہ لاحق ہو۔ کیا وہاں درندے تو موجود نہیں جن سے ان کی زندگی کی حفاظت ناممکن ہو، کیا وہاں گھاس اور پانی مہیا ہو سکتا ہے۔ ایک چرواہا اپنے گلے کو خشک میں لے کر نکلنے سے پہلے اس نوعیت کی بہت سی باتیں سوچتا ہے اور پھر کہیں کوئی قدم اٹھاتا ہے لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ جن حکمرانوں کو مسلمان ممالک اور مسلم قوم کی سربراہی کا منصب حاصل ہو جاتا ہے انہیں اپنے دینی بھائیوں سے اتنی بھی ہمدردی نہیں ہوتی جتنی کہ ایک چرواہا ہے کہ بھڑکے گلے سے ہوتی ہے۔ وہ یونانی دیوتاؤں کی طرح جس طرح چاہتے ہیں انسانوں کی قسمت سے کھیلتے ہیں اور کوئی بڑے سے بڑا قدم اٹھاتے ہوئے قطعاً نہیں سوچتے کہ اس کے نتائج ملک و ملت اور خود ان کے لیے کتنے تباہ کن ہوں گے۔ وہ جس طرح چاہتے ہیں پوری قوم کی قسمت کا بلا تکلف سودا کر لیتے ہیں۔ ایک آدمی اپنے مکان کا فرنیچر کسی دوسرے

لے مکروہ صاحب کی ان ساری کارروائیوں کی تفصیل پاکستان کے اخبارات سے حاصل کی گئی ہے مثلاً جنگ، نوائے وقت، کوہستان، مشرق اور پاکستان ٹائمز۔

مکان میں منتقل کرتے ہوئے یہ سوچنا ہے کہ کیا یہ مکان اس فرنیچر کے لیے موزوں بھی ہے۔ لیکن شیخ طور صاحب نے نگر و مہ کو ملک کی باگ ڈور دیتے ہوئے اتنا بھی غور نہیں کیا۔

مطلق العنان ذمہ داری رکھنے والے حکمرانوں کے آمرانہ فیصلوں کے جواز میں بعض لوگ یہ بھی کہتے سنے گئے ہیں کہ عوام کو کیا معلوم کہ ان حضرات کو کس قسم کی مجبوریاں لاحق ہوتی ہیں۔ لیکن یہ دلیل بڑی بودی اور کمزور ہے۔ وہ عوام جو حکمرانوں کے اللوں تلوں کے لیے روپیہ مہیا کرتے ہیں، جو ان کی ہر مصیبت اور پریشانی میں ساری تلخیاں بھلا کر ان کا ساتھ دیتے ہیں، جو ان کے اشارے پر اپنی جانوں تک کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ جن کی ان تھک محنت، جن کے غلصانہ تعاون، جن کے جذبہ ایثار اور اطاعت کی پیشی پر ملک کے حفظ و بقا اور اس کی ترقی کا سارا دار و مدار ہوتا ہے، انہیں کوئی فیصلہ کن قدم اٹھاتے وقت یکسر نظر انداز کر دینا نہ صرف بہت بڑی عاقبت ناپسندیدہ ہے بلکہ احسان فراموشی بھی ہے۔ جن لوگوں کے وجود سے کسی مملکت کا وجود قائم ہوتا ہے، جن کا اتفاق و اتحاد مملکت کی سالمیت کا ضامن ہوتا ہے، جن کا خون سپینہ اس کی تعمیر و ترقی میں گارے کا کام دیتا ہے، انہیں ان کی قسمتوں کا فیصلہ کرتے ہوئے نظر انداز کر دینا اور ان کی پسند اور ناپسند کو کوئی اہمیت نہ دینا کسی لحاظ سے بھی دیا ندرانہ روش نہیں کہی جاسکتی جب فیصلہ عوام کی قسمت کا ہو رہا ہو تو سب سے پہلے انہیں اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ ان پر کیا پتے والی ہے۔

مملکت کی سربراہی کوئی نجی کاروبار نہیں جس کے تجارتی راز افشا ہونے سے منافعوں کی اجارہ داری کو نقصان کا خطرہ لاحق ہو۔ یہ ایک ایسا فرض ہے کہ اس میں جب تک ہر فرد پورے خلوص، احساس ذمہ داری اور خوش دلی کے ساتھ شریک نہ ہو اس وقت تک یہ نجی سرانجام نہیں دیا جاسکتا۔ اس بنا پر اس میں عوام کی خوشدلانہ شرکت انتہائی ضروری ہے۔ اور جو لوگ

اس کے بغیر امور مملکت کو چلانے کا ارادہ کرتے ہیں اُن کے سامنے جلد ہی اپنی اس حماقت کے سنگین نتائج نہایت واضح طور پر آجاتے ہیں۔ جن سربراہوں نے بھی عوام کو اعتماد میں لیے بغیر اور انہیں سلطنت کے معاملات میں شریک کیے بغیر کوئی اقدام کرنا چاہا، انہیں نہ صرف خود شدید ناکامی سے دوچار ہونا پڑا بلکہ قوم اور ملک کو بھی اُن کی اس غلطی کی پاداش میں نہایت بُرے دن دیکھنے پڑے۔ اس آمرانہ طرز فکر اور طرز عمل کی پٹلہ اور مسولینی سے بہتر کون تر جانی کر سکتا ہے اور ان سے زیادہ اپنے عزائم اور ارادوں میں کون مخلص ہو سکتا ہے لیکن ان کے اخلاص، جذبہ ایثار، ان کی غیر معمولی جرأت اور بہادری کے باوجود اُن کا اور خود اُن کی قوموں کا جو حشر ہوا ہے وہ بڑا حسرتناک ہے۔ یہی انجام ماضی قریب میں شاہ فاروق اور چین کے چنگ کاٹی ٹیک کا ہو چکا ہے۔ اور اب گھانا کے نکر و مہر اسی انجام کو پہنچے ہیں۔ زمان و مکان کے اختلاف کے باوجود آخر تاریخ نے اُن کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیوں کیا ہے؟ اس کا جواب ایک ہی ہے کہ ان سب نے قومی امنگوں اور ارادوں کو یکسر نظر انداز کر کے قوم کی قسمت سے کھیلنے کی ناپاک سعی کی اس لیے یہ سارے ایک ہی انجام کو پہنچے۔ انہوں نے قوم کو اعتماد میں لینے کے بجائے پولیس اور فوج کی قوت پر اعتماد کیا اور لوگوں کے دلوں کو مسخر کرنے کے بجائے انہیں اندھے پھرے قوانین کی جکڑ بندیوں میں جکڑ کر حکومت کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کے دل و دماغ میں نفرت کا شدید جذبہ پیدا ہوا اور انہوں نے اپنے ان کرم فرماؤں سے جلد ہی نجات حاصل کرنے کی سعی کی۔ کسی آمر مطلق کا اس سے زیادہ حسرتناک انجام اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو بچے ہر صبح اُس کی تعریف و توصیف میں ترانے گائیں، اُس کے حق میں "عظیم مسیحا" کے نعرے بلند کریں، جگہ جگہ اُس کے نصب کیے ہوئے بتوں کو سلامی دیں، وہ اس کے اقتدار سے محروم ہونے کے ساتھ ہی اس کے بتوں کو روندنا شروع کر دیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ جبر سے بھگی ہوئی گردنیں، ہمیشہ بغاوت پر آمادہ رہتی ہیں۔ اور جب انہیں ذرا سا موقع بھی ملتا ہے تو فوراً جبر سے نجات حاصل کرنے کے

یہ جدوجہد کرنے لگتی ہیں۔ اس جدوجہد میں توازن نہیں ہوتا بلکہ برسوں کے گھٹے ہوئے جذبات جوش کر ہوش پر غالب کر دیتے ہیں اور وہ عوام اپنی آزادی کا قرض مع سود چکاتے ہیں۔

”رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند“ ایک غیر انسانی نظر یہ ہے۔ یہ اُس غلط ذہنیت کا آئینہ دار ہے جس کے تحت فرمانروا یہ سمجھ کر عنانِ اقتدار سنبھالتا ہے کہ سلطنت اس کی ذاتی ملکیت ہے اور وہ اس بات کا پورا پورا حقدار رکھتا ہے کہ اُس کے ذرائع و وسائل کو ذاتی مفادات کے لیے جس طرح چاہے استعمال کرے۔ وہ بلا شرکت غیرے پوری قوم کا مالک ہے۔ کوئی فرد اُس سے اُس کے کسی طرزِ عمل کے بارے میں باز پرس نہیں کر سکتا وہ اپنی فکر و اندر جو چاہے کرے، جسے چاہے زندہ رہنے دے اور جسے چاہے زندگی کے حق سے محروم کر دے، اُس سے کسی قسم کا کوئی سوال نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ غیر مسئول اقتدار کا مالک ہے۔ وہ اپنی سلطنت کے حدود کے اندر خدائی اختیارات رکھتا ہے۔ اس کی کبریائی کے سامنے کوئی لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اُس کا دماغ ہر دوسرے دماغ سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ اتنا ارفع کہ اُس میں کوئی غلط چیز کبھی راہ نہیں پاسکتی۔ وہ ہر عیب سے پاک، ہر خطا سے منزہ اور ہر خامی سے عاری ہے۔ اس کی نگاہیں بڑی دُور رس ہوتی ہیں۔ اس بنا پر عوام بیچارے اُس کی سوچی ہوئی مصلحتوں کو سمجھنے سے یکسر قاصر ہوتے ہیں۔ لہذا ان کی فلاح کار از اسی بات میں مضمر ہے کہ وہ امورِ مملکت کی ذمہ داری فرمانرواؤں پر ڈال کر ملکی معاملات سے بالکل بے تعلق ہو جائیں اور اقتدار کے تخت سے انہیں جو احکام صادر ہوں انہیں نہ صرف بلا چون و چرا قبول کریں بلکہ پورے جذبہ و شوق کے ساتھ انہیں بجالائیں۔ اُن کی عافیت اسی میں ہے کہ ان خداؤں کی اعلیم میں تسلیم و رضا کے پیکر بن کر زندہ رہیں۔

یہ وہ طرز فکر ہے جسے انسان نے کبھی صدق دل سے قبول نہیں کیا اور جسے ختم کرنے کے لیے انسانیت کے بڑے بڑے ہادیوں، رہنماؤں اور محسنوں نے بھرپور کوشش کی ہے۔ صدیوں کے تجربات نے اس نظریہ کو غلط ثابت کیا ہے۔ دنیا میں جس شخص یا گروہ نے اس نظریہ کو اپنانے کا ناپاک عزم کیا اُس کا وہی حشر ہوا جو انسانیت کے ہی خواہوں ہاتھوں اس نظریہ کے علمبردار خسرو پرویز کا آج سے کئی سو سال پہلے ہوا تھا۔

اس باطل نظریے اور غیر انسانی طرز فکر کے خلاف انسانیت کی بغاوت کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ انسان جب تک انسان ہے وہ رضا و رغبت کے ساتھ نہ تو اپنے انسانی حقوق چھوڑنے پر آمادہ ہو سکتا ہے اور نہ وہ کسی دوسرے انسان کو وہ لیندو بالامقام دینے پر تیار ہوتا ہے جس پر فائز ہو کر وہ اپنے جیسے انسانوں میں اپنی کیر مائی کا سکہ چلائے اپنے انسانی حقوق کا غیر معمولی احترام اور انسان کی خدائی سے بغاوت، یہ دونوں باتیں اُس کی فطرت میں شامل ہیں۔ اس نے وقتی مجبور یوں کے تحت بگڑے ہوئے انسانوں کے اس غلط طرز فکر اور طرز عمل کو بلاشبہ کبھی کبھی گوارا کیا لیکن اس کی فطرتِ سلیم ہمیشہ اُسے اُن کے خلاف سرگرم عمل کرتی رہی اور جب کبھی اُسے ان سے نجات کی راہ نظر آتی تو فوراُ اس پر کامزن ہونے کی کوشش کی یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے جب اپنی دعوت کا آغاز کیا تو سب سے پہلے ان جھوٹے خداؤں سے ستائی ہوئی انسانیت نے اُس پر ٹیک کہا۔ کیونکہ ان مقدس نفوس کی عافیت میں آنے سے انہیں انسان کی غلامی سے گلو خلاصی اور اپنی کھوئی ہوئی انسانیت کے ملنے کی توقع تھی۔